علامہ اقبال سے میری ملاقات

خلیفہ عبدالحکیم

میں لاہور کے ایک مدرسےمیں ابھی ابجد خوان تھا کہ اقبال کا نام کانوں میں پڑنے لگا۔ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں دور دور سے واعظ اور شاعر، خطیب اور لیڈر جمع ہوتے تھے۔ مولانا نذیر احمد جیسے ادیب اور خطیب اور مولانا حالی جیسے شاعر وہاں قوم کو رلاتے، شرماتے اور گرماتے تھے۔ اقبال اس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر تھے۔ وہ اس وقت نوجوان ہوں گے لیکن ہم اپنی کم عمری کی وجہ سے پچیس برس کے شخص کو بھی بزرگ سمجھتے تھے۔ اقبال وہاں بڑی بڑی طویل دس دس بارہ بارہ بندوں کی نظمیں ایک خاص لے میں پڑھتے تھے جو بڑی پر سوز اور درد انگیز ہوتی تھیں۔ اقبال کی شاعری کا سکہ سب سے پہلے یہیں پر بیٹھا اور چند سال میں سب کو محسوس ہونے لگا کہ ایک نیا ستارہ شاعری کے افق پر ابھرا ہے جس کے اندر یہ ممکنات معلوم ہوتے ہیں کہ وہ آگے چل کر مہتاب و آفتاب بن جائے۔ اسی زمانہ میں اور غالباً حمایت اسلام کے ایک جلسے ہی میں علامہ شبلی نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ جب حالی اور آزاد کی کرسیاں خالی ہوں گی تو لوگ اقبال کو ڈھونڈیں گے۔ اس زمانے میں ان سے میری ذاتی ملاقات بعید از قیاس بات تھی۔ ولایت جانے سے قبل اور واپسی کے کئی سال بعد تک اقبال انجمن حمایت اسلام میں نظمیں سناتے رہے۔ میں نے پورا 'شکوہ' اور ' شمع و شاعر ' انہیں جلسوں میں ان کی زبان فیض ترجمان سے سنا ہے۔ ' شمع و شاعر ' انہوں نے اپنی پر سوز لے میں پڑھی اور ' شکوہ ' بغیر لے کے بڑے پر جوش اور موثر انداز میں۔ لوگ ان کی لے کے دلدادہ تھے' شور مچانا شروع کیا کہ لے سے پڑھئے۔ انہوں نے کہا کہ لے سے پڑھنے کی نظم نہیں ہے۔ اس پر ایک بد ذوق وکیل بولے کہ اگر لے سے پڑھیں تو میں ایک کثیر رقم انجمن کو چندے میں دوں گا۔ اس پر اقبال کو غصہ آگیا اور اس شخص کو ڈانٹ دیا کہ تم کو نہیں معلوم کس قسم کے اشعار لے سے پڑھنے چاہئیں اور کس قسم کے سادہ اوو موثر طریقے سے ' موسیقی ہر کلام کے لئے موزوں نہیں ہوتی - یہ دور گذر گیا۔ اقبال ولایت سے واپسی پر بیرسٹری کرتے تھے، شاعری کم کرتے تھے' لیکن لوگ ان کی شاعری کے گرویدہ ہو چکے تھے۔ کبھی کبھار ان کی کوئی نظم شائع ہوتی تھی تو ارباب ذوق کو محسوس ہوتا تھا کہ ایک بڑی نعمت آسمان سے نازل ہوئی ہے۔ ابھی تک اقبال کو پوری طرح یہ احساس نہیں تھا کہ میں شاعری سے کیا عظیم الشان

کام لے سکتا ہوں اور شاید کسی قدر اس خیال کا اثر باقی تھا جو انہوں نے یورپ کے قیام کے دوران میں اپنے رفیق عبدالقادر کے سامنے ظاہر کیا تھا کہ شاعری کے ذوق نے ہماری قوم میں سے جوش عمل کو زائل کردیا ہے، اس لئے ارادہ ہے کہ شاعری ترک کردوں۔

مدبر مخزن سے کوئی اقبال جاکے میرا پیام کہدے
جو کام کچھکر رہی ہیں قومیں انہیں مذاق سخن نہیں ہے

اقبال کے بیرسٹر بننے کی کوشش میں ایک بڑا افسوسناک حادثہ سمجھتا ہوں۔ اس فن سے ان کو کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا لیکن انہوں نے یہ پیشہ دو وجوہ سے اختیار کیا تھا۔ ایک تو پیٹ پالنے کے لئے اور دوسرے اس لئے کہ اس میں ملازمت کے مقابلے میں انسان زیادہ آزاد ہوتا ہے — آزاد ان معنوں میں کہ وکیل حکومت کا ملازم نہیں ہوتا اور مقدمہ لینا یا نہ لینا بھی اپنے اختیار کی بات ہے۔ لیکن غم روزگار ہمارے ملک میں اہل کمال کو پوری طرح آزاد نہیں ہونے دیتا۔ علامہ خود ہی فرماتے ہیں:

وہ چیز نام ہے دنیا میں جس کا آزادی
سنی ضرور ہے دیکھی کہیں نہیں میں نے

میں نے ایک روز عرض کیا: ڈاکٹر صاحب! یہ وکالت کا پیشہ دنیا داری کا نچوڑ ہے — حرص، ہوس، بغض، ظلم، جھوٹ، بہتان۔ عدالتوں کی فضا اس تمام شیطنت سے لبریز ہوتی ہے، اس میں انسانوں کے ادنیٰ ترین جذبات کی نفسا نفسی اور افراتفری ہوتی ہے، آپ جیسے جذبات اور افکار کے انسان کے لئے تو یہ پیشہ کسی طرح بھی موزوں نہیں ہوسکتا۔ فرمانے لگے کہ نہیں اس میں سے ایک بڑا فائدہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کی ان خباثتوں کو عریاں دیکھ کر طبیعت میں بڑا رد عمل پیدا ہوتا ہے اور اس کثافت سے گھبرا کر روح بے تابی سے لطافت کی طرف گریز کرتی ہے۔ مجھے خیال ہوا کہ علامہ محض طبیعت کی تسکین کے لئے جواز نکال رہے ہیں۔ وہ دل و دماغ جو اعلیٰ ترین جذبات اور افکار کی آفرینش کا اہل تھا وہ اس جھگڑے میں الجھا رہتا تھا کہ زید اور عمرو دو حریصوں میں سے ایک حریص کو حق بجانب ثابت کیا جائے، جن کے آپ وکیل ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ وہ فضول اور بے بنیاد مقدمے نہیں لیتے تھے۔ ان کو روپے کی ضرورت ضرور تھی لیکن اس کی بے جا ہوس نہیں تھی۔ چنانچہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایک موکل اصرار کر رہا ہے کہ آپ میرا مقدمہ لے لیں اور معقول نقد معاوضہ محنت بھی پیش کر رہا ہے لیکن وہ اس کو سمجھاتے جاتے ہیں کہ دیکھو بھائی تمہارے مقدمہ میں کچھ جان نہیں ہے، خواہ مخواہ اپنا روپیہ ضائع مت کرو۔ اور موکل مصر ہے کہ آپ سے کیا، جیتنا ہارنا میری قسمت کا معاملہ ہے، آپ اجرت لیجئے اور میری طرف سے پیش ہوجائیے۔ لیکن اقبال کو

وہ آمادہ نہ کرسکا اور ناراض ہوکر واپس ہوگیا ۔ ان کی اس وکالت کی زندگی کا ایک واقعہ مجھے یاد آگیا جو ایک سبق آموز لطیفہ ہے ۔ ایک مولوی صاحب ان کے پاس آیا جایا کرتے تھے اور کچھ دینیات اور فقہ کے مسائل پر گفتگو کرتے تھے اور کچھ اپنے ورثۂ پدری کے جھگڑے کے متعلق ۔ وہ اپنے والد مرحوم کے ترکے سے اپنی بہن کو حصۂ شرعی دینا نہیں چاہتے تھے اور انگریزی قانون کا سہارا ڈھونڈتے تھے۔ پنجاب میں دینداری کے بڑے بڑے مدعی صوم و صلوٰۃ کے پابند لوگ ورثے کے معاملے میں عدالت میں علی الاعلان کھڑے ہوکر یہ کہ دیتے ہیں کہ ہماری برادری یا ہمارے علاقے میں ورثہ شرع محمدی کے مطابق تقسیم نہیں ہوتا بلکہ رواج کے مطابق ہوتا ہے اور رواج لڑکیوں کو ورثے میں حصہ نہیں دلاتا ۔ اس بارے میں شہادتیں پیش کی جاتی ہیں اور عدالت رواج کے ثابت ہونے پر رواج کے مطابق فیصلہ کرتی ہے ۔ یہ مولوی صاحب اقبال کو ہمیشہ طعنہ دیتے تھے کہ تم اس قدر علم دین رکھنے کے باوجود اور اسلام اور اس کے نبی سے اس قدر عشق کا دعویٰ کرنے پر بھی ڈاڑھی کیوں نہیں رکھتے۔ آخر ایک روز تنگ آکر اقبال نے کہا کہ دیکھئے مولوی صاحب علم اور ایمان کے باوجود ہر شخص کے عمل میں کچھ نہ کچھ کمزوری ہوتی ہے ۔ آپ کی کمزوری اور خلاف شرع حرکت یہ ہے کہ آپ بہن کو حصہ نہیں دیتے اور میری کوتاہی یہ ہے کہ میں ڈاڑھی منڈاتا ہوں، لائیے ہاتھ بڑھائیے، اس وقت ایک معاہدہ ہوجائے جس سے آپ اور میری کمزوریاں بیک وقت رفع ہوجائیں، آپ بہن کو ورثے میں حصہ دے دیجئے اور میں ڈاڑھی بڑھائے لیتا ہوں ۔ لیکن مولوی صاحب کو ہمت نہ ہوئی ۔ ۔ ۔

اقبال وکالت میں کچھ زیادہ وقت صرف نہیں کرتے تھے ، اس کو محض پیٹ پالنے کا ذریعہ سمجھتے تھے ۔ صرف ہائی کورٹ میں اپیل کے مقدمے لیتے تھے جن میں درد سری کم ہوتی ہے اور علم و عقل اور نقطہ بینی سے زیادہ کام لینا پڑتا ہے۔ مقدمے بھی بہت چن کر تھوڑی تعداد میں لیتے تھے ۔ اس وجہ سے میرا خیال ہے کہ ان کی وکالت کی آمدنی کبھی ایک ہزار ماہوار سے زیادہ نہ ہوئی ۔ وہ طبعاً شاعر اور عالم اور علم دوست شخص تھے ، لیکن میں نے ایک بات ان کی زندگی میں ایسی دیکھی جو مشاہیر میں سے شاید ہی کسی کی زندگی میں ملے ۔ ان کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا تھا اور ہر شخص ان کے پاس ہر وقت بے تکلف چلا آتا تھا ۔ ان کے گھر اور ان کی صحبت پر حافظ کا یہ شعر صادق آتا ہے :

ہر کہ خواہد گو بیار ہر کہ خواہد گو برو
گیر و دار و حاجب و دربان دریں درگاہ نیست

شاعری کی وجہ سے وہ ہر دلعزیز بہت تھے ۔ نہ صرف طالب علموں اور علم دوست لوگوں کو ان سے ملنے کی آرزو رہتی تھی بلکہ ایسے لوگوں کو بھی جو ان کو بڑا شاعر اور صاحب کمال سمجھ کر ان سے ملاقات کو ایک نعمت سمجھتے ۔ ان کے پاس مختلف امتحانوں کے پرچے آتے تھے ۔ سال کے بعض مہینوں میں جب بھی میں ان سے ملا تو دیکھا کہ مہمل جوابات کی ورق گردانی ہو رہی ہے ۔ مجھے ان کے اس مشغلے پر اس وقت افسوس نہیں ہوتا تھا جتنا اب ہوتا ہے کہ غم روزگار اور زندگی کی مجبوریوں نے اس یگانۂ عصر کے قیمتی اوقات اور قوتوں کو کن کاموں میں لگا رکھا تھا ۔ اس جوہر ناشناس تمدن کو کیا کہئے جو ایک غیر معمولی صاحب کمال کو بھی معمولی سادہ زندگی بسر کرنے کے لئے غم روزگار سے بے نیاز نہ کر سکے ۔ اسی وقت اور اسی محنت کو اگر وہ کسی علمی کام یا شاعری میں صرف کر سکتے تو لاتعداد انسان اس سے مستفید اور لطف اندوز ہوتے ۔ اس زمانے میں ابھی اردو نثر و نظم لکھنے والے صاحب کمال ہونے پر بھی معقول معاوضہ حاصل نہ کر سکتے تھے ۔ ایک مرتبہ اقبال نے مجھ سے فرمایا کہ اگر ہماری قوم میں اہل قلم اچھا روزگار پیدا کر کے اطمینان کی زندگی بسر کر سکتے تو میں اس کے سوا کوئی اور کام نہ کرتا۔یہ اس زمانے کی بات ہے جب اقبال ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے تو مشہور تھے لیکن ابھی تمام قوم کے دل و دماغ پر ان کا قبضہ نہیں ہوا تھا اور معقول قیمت پر اردو کتابیں خریدنے کا رواج نہیں تھا ۔ مولانا شبلی جیسے مشہور مصنف بھی کوئی علمی کتاب پانچسو سے زیادہ نہیں چھپواتے تھے ۔ عرصے سے احباب مصر تھے کہ اپنا مجموعۂ کلام چھپواؤ لیکن وہ سن کر ٹال دیتے تھے ۔ اس بارے میں یہاں تک ٹال مٹول ہوئی کہ حیدر آباد میں ایک صاحب نے اخباروں اور رسالوں سے ان کی تمام مطبوعہ نظمیں جمع کر کے ، ان کی اجازت کے بغیر اور بغیر ان کو خبر کئے ، ایک مجموعہ چھپوا کر فروخت کرنا شروع کر دیا جس سے وہ بہت برہم ہوئے ۔ کوئی اچھا شاعر اپنے مختلف زمانوں کا کلام جوں کا توں شائع کرنا نہیں چاہتا ۔ بعض نظموں کے متعلق وہ چاہتا ہے کہ دنیا انہیں فراموش کر دے ، بعض اشعار میں رد و بدل کرتا ہے ، کہیں کچھ مٹاتا ہے ، کہیں اضافہ کرتا ہے ۔ کچھ نہ پوچھئے کہ ان صاحب نے کیا غضب کیا اور اقبال کو ان پر کس قدر غصہ آیا ۔

اقبال نے سب سے پہلے اسرار خودی کو اپنے صرفے سے طبع کرایا اور صرف پانچسو نسخے چھوائے ۔ ان میں بہت سے نسخے دوست احباب نے اچک لئے ۔ جن ملنے والوں کو وہ اس حکیمانہ شاعری کے سمجھنے اور لطف اٹھانے کا اہل سمجھتے تھے انکو خود بھی ایک نسخہ تحفتاً عنایت فرما دیتے تھے ۔ میں اس زمانے میں ایم اے میں فلسفہ پڑھتا تھا اور جب کبھی موقع ملتا فیض صحبت کے لئے

ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتا تھا ۔ اپنے منشی طاہر دین کو بلایا اور کہا کہ ان کو ایک نسخہ دے دو لیکن ان سے قیمت نہ لینا ۔ فرمانے لگے کہ ہمارے زمانے کے امرا کی کتب بینی کا شوق ملاحظہ ہو ، میرے ایک دوست نے اسرار خودی کا ایک نسخہ ایک بڑے دولت مند نواب صاحب کے پاس پہنچا دیا ۔ نواب صاحب کے ایک بڑے بھائی بھی ہیں ۔ مجھے خبر ملی ہے کہ وہ دونوں نواب آپس میں اس ایک نسخے پر جھگڑ رہے ہیں کہ یہ کس کا ہے، میرا ہے یا تمہارا ، لیکن اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ ایک روپیہ خرچ کر کے دوسرا نسخہ خرید لیں ۔

اسی طرح ایک روز نا قدری عالم کی شکایت کرنے لگے ۔ میں نے اپنی عمر میں دو تین مرتبہ سے زیادہ کسی تعلی یا تفاخر کا فقرہ ان کی زبان سے نہیں سنا ، اپنے آپ کو بڑا بنانا اور بتانا ان کی سیرت کا جزو نہیں تھا ۔ کہنے لگے کہ دیکھو زمانے زمانے کا فرق ہے ، فیضی کو اکبر مل گیا جس سے فیضی کے کمال نے بھی پرورش پائی اور شہرت دوام بھی حاصل کی ، فیضی کے پاس کیا تھا جو میرے پاس نہیں ہے ؟ لیکن زمانہ پلٹا کھا گیا ہے ۔ اس زمانے میں ان کے دل میں یہ احساس پیدا ہو رہا تھا کہ میں اپنے افکار اور اپنی شاعری کی قوت سے قوم کے دل و دماغ میں انقلاب پیدا کر سکتا ہوں ۔ یورپ میں کہی ہوئی دو نظموں میں یہ دو شعر اس احساس کے شاہد ہیں :

میں ظلمت شب میں لے کے نکلونگا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری ، نفس میرا شعلہ بار ہوگا
زمانہ دیکھے گا جب مرے دل سے محشر اٹھے گا گفتگو کا
مری خموشی نہیں ہے گویا مزار ہے حرف آرزو کا

اسی مضمون کے وہ اشعار بھی ہیں جن میں انہوں نے اپنے رفیق عبد القادر کو مخاطب کیا ہے :

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افق خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں
شمع کی طرح جئیں بزم گہ عالم میں
خود جلیں دیدہ اغیار کو بینا کر دیں

اقبال کی گفتگو میں یہ خوبی تھی کہ ہر قسم کا شخص ان سے ملتا تھا اور وہ ہر شخص سے اس شخص کے مذاق کی بات کرتے تھے ۔ وہ کافر کے کفر سے، ملحد کے الحاد سے ، متقی کے تقویٰ سے اور گنہگار کی گنہگاری سے اور رند کی رندی سے براہ راست واقف تھے اور ہر صنف سے جب وہ بات کرتے تھے تو سننے والے کو یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ سنی سنائی باتیں کر رہا ہے اور ان کی اصلیت سے واقف نہیں ، اس لئے ان کی گفتگو کبھی بے معنی اور پھیکی نہیں

ہوتی تھی۔ اور ایک بڑی خوبی ان میں یہ تھی کہ ان میں تصنع کا نام و نشان نہیں تھا۔ ان کو یہ خواہش نہیں تھی کہ لوگ مجھے خواہ مخواہ متقی یا صوفی سمجھیں ' تصوف کی باتیں صوفیائے کرام کی طرح کرتے تھے لیکن کبھی کسی کو ذلیل کرنے کے لئے اس کی ہنسی نہیں اڑاتے تھے ۔ چونکہ وہ خود ظرافت پسند تھے اس لئے ان کے بے تکلف ہمنشیں بھی ان سے ہنسی مذاق کی باتیں کرتے تھے ۔ میرے سامنے کی بات ہے ' لاہور کے ایک حکیم صاحب کبھی کبھی ان کے پاس آ بیٹھتے تھے ۔ وہ زرا رند مشرب تھے' ارباب نشاط کے کوٹھوں پر بھی نظر آتے تھے ۔ اقبال نے ہنس کر پوچھا : '' فرمائیے حکیم صاحب! آج کل اس طبقے میں کس کس کے ہاں آنا جانا ہے '' ۔ حکیم صاحب بولے '' جی کہاں! اب تو بس یہیں آتا ہوں '' ۔

بعض اوقات علمی باتوں میں بھی ان کا انداز بیان ظریفانہ ہوتا تھا ۔ ایک روز فرمانے لگے : دو چیزیں خاص انگریزوں کی ایجاد ہیں : ان میں ایک ہے بے انک گیسٹ (یعنی وہ مہمان جس سے اپنے کھانے کی قیمت وصول کی جائے لیکن اس کے باوجود مہمان کہلائے) ، اور دوسرے دیانتداری بہترین تدبرو مصلحت ہے ۔ اور قومیں تو دیانتداری کو دین و ایمان اور اخلاق اور تزکیۂ نفس کے ساتھ وابستہ کرتی رہیں لیکن اس قوم نے اس کو بطور پالیسی کے اختیار کرنے کی تلقین کی ۔ اسی طرح فرمایا کہ لوٹ ، جبر ، ظلم ، ناجائز مطالبے ، یہ سب کچھ پہلی جابرانہ اور بے آئین حکومتوں میں بھی تھا اور موجودہ آئینی حکومتوں میں بھی ہے ۔ فرق صرف یہ ہے کہ اب حکومتیں یہ کرتی ہیں کہ جو کچھ کرنا ہو اسے پہلے لکھ لو اور اس کا نام رکھو ضابطہ اور قانون اور پھر جو جی چاہے کرو ، بس اپنے ہر فعل میں کسی قانون اور ضابطہ کا حوالہ دے کر اس کو جائز بنالو ۔ بس لکھ لینا اور بغیر لکھے کرنا : اصل فرق یہی ہے ۔

اقبال کے ایک دوست بہت سیاہ فام تھے اور اقبال ان کی رنگت پر ہمیشہ طبع آزمائی کرتے رہتے تھے ۔ یہ صاحب نائٹ یعنی سر ہوگئے ۔ اقبال نے کہا : '' انگریزوں نے تم کو صحیح خطاب دیا ہے ۔ لیکن خطاب کیا ہے محض تمہاری حقیقت بیان کر دی ہے ۔ تم پہلے بھی نائٹ یعنی شب سیاہ ہی تھے '' ۔ اسی طرح یہ صاحب ایک انگریزی ڈنر میں جس میں اقبال بھی تھے سیاہ سوٹ اور سیاہ موزے اور بوٹ پہنے ہوئے آئے ۔ جو رنگ جسم کا تھا وہی لباس کا ۔ اقبال نے بڑے تعجب سے ان کو دیکھ کر کہا کہ ارے تمہیں یہ کیا ہو گیا کہ تم برہنہ ہی اس دعوت میں چلے آئے ۔ میرا خیال ہے کہ اگر کوئی شخص اقبال کے لطیفے اس کے ہمنشینوں سے پوچھ پوچھ کر جمع کرے تو ظرافت کا ایک دلچسپ مجموعہ بن جائے ۔

میں ابھی عرض کرچکا ہوں کہ ان کا گھر ہمیشہ ہر شخص کے لئے کھلا

رہتا تھا ۔ بظاہر یہ تضیع اوقات معلوم ہوتی ہے، بعض لوگوں کے دل میں خیال پیدا ہوگا کہ یہ شخص مطالعہ کب کرتا تھا، بڑے بڑے مسائل کے متعلق سوچتا کب تھا اور ہر کس و ناکس کو کیوں اجازت عام تھی کہ جب تک چاہے اس کے پاس بیٹھ کر اس کا وقت ضائع کرے ۔ میں نے تو کبھی یہ سوال ان سے نہیں کیا ۔ شاید اس لئے کہ میں خود ان کا وقت ضائع کرنے والوں میں تھا ۔ بعض اور لوگوں نے ان سے کہا تو جواب دیا کہ میرا وقت ضائع نہیں ہوتا ۔ رنگ رنگ کے لوگ میرے پاس آتے ہیں اور طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں ۔ یہ بھی براہ راست نوع انسان کے مطالعے کا ایک ذریعہ ہے ۔ اصل مطالعہ انسانی فطرت کا مطالعہ ہے ۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی تھی جو میں نے ان کی صحبت میں محسوس کی کہ خواہ کوئی شخص بھی ان کے پاس بیٹھا ہو اور کوئی بات بھی کر رہا ہو ان کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ سوچ رہے ہیں ۔ سنانے والے کی بات بھی سن رہے ہیں اور خود سوچتے بھی جاتے ہیں ۔ باتیں کرنے والے کو یہ وہم و گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ اس وقت کیا عجیب و غریب مضامین اقبال کے ذہن میں پیدا ہو رہے ہیں ۔

واقعہ یہ ہے کہ اقبال جس محفل میں بھی ہوتے تھے وہ باہمہ اور بے ہمہ ہوتے تھے ۔ سب کے ساتھ بھی ہیں اور سب سے الگ بھی ۔ رقص و سرود کی محفل میں بیٹھے ہیں، سب لوگ گانے سے لطف اٹھا رہے ہیں اور اٹھکھیلیاں کر رہے ہیں، ادھر ادھر کی چھیڑ چھاڑ ہو رہی ہے، لیکن یک بیک اقبال کی طرف جو دیکھا تو کمال رقت سے ان کی آنکھوں میں سے آنسو ٹپک رہے ہیں ۔ مے و نغمہ جو دوسروں کے لئے نشہ اندوہ ربا تھا وہ اس شخص کو خدا جانے کس سوز و گداز کے عالم میں پہنچا دیتا تھا ۔ اقبال کے بعض ہمنشین اس کے انداز طبیعت کو سمجھ گئے تھے ۔ باتیں ہو رہی ہیں، انہوں نے دیکھا کہ اقبال خاموش ہے اور ایک خاص قسم کی کیفیت اس کے چہرے سے نمودار ہے ۔ وہ سمجھ جاتے کہ اشعار نازل ہو رہے ہیں ۔ چنانچہ وہ کچھ عرصے کے لئے اقبال کو اس کیفیت میں چھوڑ دیتے تھے ۔ اس کے بعد ان کو معلوم ہوتا کہ مقدس لاجواب نظم ہم سے باتیں کرنے کے دوران میں ہی اس پر نازل ہوئی ۔ اس سے آپ اندازہ کرلیجئے کہ اقبال کے لئے کوئی صحبت بھی تضیع اوقات کا موجب نہیں بن سکتی تھی ۔

ایسی طبیعت بھی خدا کی کیا بڑی نعمت ہے جس کو جلوت میں بھی خلوت حاصل ہو ۔ یہ صوفیا کے "دست بکار و دل بیار" والا معاملہ ہے ۔ یہ لوگ انسانوں کے ساتھ اسی طرح رہتے ہیں جس طرح بطخ پانی میں ۔ چاروں طرف سے پانی کے تھپیڑے پڑ رہے ہیں، لیکن پر خشک کے خشک ہیں ۔